(غلام گردش)

''لوگ درلوگ''

ہفتہ پہلے فرخ گوئندی گھر آیا۔ باتیں شروع ہوگئیں۔ ترکی واپس جانے کی حتمی تیاریاں کررہا تھا۔ بتانے لگا کہ اب چند مہینے ملاقات نہ ہو پائے گی کیونکہ یہ تمام وقت استنبول میں گزرے گا۔ دراصل گوئندی اور ریما بھابھی نے وہاں ایک خوبصورت ٹھکانہ لے رکھا ہے۔ جب یہ دونوں کھرے لوگ پاکستان کی وحشتوں سے تنگ آجاتے ہیں، تو استنبول لوٹ جاتے ہیں۔ لاہور میں گوئندی کا ''جمہوری پبلیکیشنز'' بدستور چلتا رہتا ہے۔ اسلیے کہ گوئندی نے کاروبار بھی نایاب طریقے سے کر رکھا ہے۔ پبلشنگ ہاؤس میں کام کرنے والے تمام لوگ، اسکے منافع اور نقصان میں شریک ہیں۔ کاروبار کرنے کا یہ ماڈل پورے پاکستان میں صرف گوئندی چلا رہا ہے۔ تمام ملازمین بھی مالک ہیں۔ گوئندی نہ بھی ہو تو کاروبار چلتا رہتا ہے۔ شائد بہتر چلتا ہو۔ اسلیے کہ گوئندی کاروبار کرنے کیلئے پیدا نہیں ہوا۔ پیسہ اسکے نزدیک بے معنی ہے۔ آج تک اسکی زبان سے دولت کی خواہش کی آرزو نہیں سنی۔ فرخ تو ''انسانی حقوق''، ''قانون کی بالادستی''، کمزور طبقے کے حقوق اور جدوجہد کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اسکی ساری زندگی بذاتِ خود ایک جدوجہد ہے۔ گوئندی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ سماج کے ان پہلوؤں پر غور کرتا ہے، جس پر ننانوے فیصد لوگ بات نہیں کرتے۔ ''پسے ہوئے لوگوں'' کے متعلق جس بھرپور طریقے سے آواز اُٹھاتا ہے، کوئی نہیں اُٹھاتا۔ گوئندی جاتے جاتے اپنی کتاب ''لوگ درلوگ'' ہاتھ میں تھما گیا۔ کتاب کی تقریب رونمائی پر کوشش کے باوجود نہ جاسکا۔ اسلیے کہ مقامی دانشوروں کی باتیں سمجھ نہیں پاتا۔ شائد میری جہالت آڑے آجاتی ہے۔ پھر جہاں بہت زیادہ لوگ ہوں، وہاں جم کر گفتگو نہیں ہوسکتی۔ ویسے بھی کافی عرصے سے تنہائی پسند ہو چکا ہوں۔ کتابیں، مطالعہ اور چند پرانے دوست۔ یہی اب میرا طرزِ زندگی ہے۔ ویسے گوئندی بھی حددرجہ اکیلا انسان ہے۔ جس مضبوطی سے ریما بھابھی نے گوئندی کا ساتھ دیا ہے، وہ بھی حددرجہ قابل تعریف ہے۔ بھابھی، لبنان کے ایک بہت آسودہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ بلا کی ذہین اور عملی طور پر گوئندی جیسے صحرانورد انسان کی شریکِ حیات ہیں۔ گوئندی پر ریما بھابھی کا بے حد مثبت اثر ہے۔

جب گوئندی نے کتاب میرے حوالے کی، تو بے ساختہ طریقے سے کہا کہ آج رات تو اسکو پڑھنے میں گزر جائیگی۔ ایسے ہی ہوا۔ تقریباً رات میں کتاب کو پڑھ لیا۔ اگلے دو چار دن، دوبارہ پڑھنے بلکہ سمجھنے میں گزر گئے۔ ہاں، ایک اور بات۔ مضامین کی فہرست پڑھ کر پہلی بار اندازہ ہوا کہ گوئندی کس کس سطح کے اہم ترین قائدین کے ساتھ وقت گزارتا رہا ہے۔ کن کن نایاب لوگوں سے واسطہ رہا ہے۔ ترکی کے وزیراعظم جناب بلند ایجوت کی بابت تو معلوم تھا کہ گوئندی کے انتہائی قریبی دوست تھے۔ مگر مضامین کی فہرست سے اندازہ ہوا کہ اس خوش بخت نے تو بھٹو سے لیکر اندر کمار گجرال، خشونت سنگھ سے لیکر ڈاکٹر انور سجاد اور حنیف رامے سے لیکر اُردن کے شاہ حسین سمیت، تقریباً دنیا کے انتہائی اہم لوگوں سے واسطہ رکھا ہوا تھا۔ گوئندی کی زندگی پر اگر کسی سیاسی شخصیت کی چھاپ ہے تو وہ صرف اور صرف ذوالفقار علی بھٹو تھا۔ بھٹو اسکی سوچ کا پہلا اور آخری عشق تھا۔

''میں نے بھٹو کو دیکھا''، اس کتاب کا پہلا مضمون ہے۔ گوئندی نے لکھا ہے کہ ''بھٹو، لاہور اور پاکستان، فروری 1974 کو وہ

جس قدر خوش تھے، شائد وہ کبھی اتنے خوش نہ ہوئے ہوں گے۔ اس روز بھٹو، لاہور اور پاکستان اسلامی دنیا کے میزبان بنے۔ بتائیں اس سے بڑی خوشی کوئی ہوسکتی ہے۔ میں نے اس لاہور کی سڑکوں پر یاسر عرفات، شاہ فیصل، انور سادات، الجزائر بومدین، شیخ مجیب، مفتی اعظم امین الحسینی، عدی امین، اور ساری مسلمان دنیا کے لیڈروں کے ہمراہ بھٹو کو دیکھا اور اسی اسلامی کانفرنس میں انہیں یہ کہتے دیکھا اور سنا ''ہم بیت المقدس ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہونگے، چاہے اسکے لیے میری جان ہی چلی جائے''۔ انہوں نے عدالت سے اپنے آخری خطاب میں کہا، ''آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ سب عدالتیں کیوں سجائی گئی ہیں۔ مسئلہ میری جان نہیں، معاملہ کچھ اور ہے۔ پاکستان آج وہ طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے، جس کیلئے انڈیا نے بیس سال لگا دیے''۔ میرے مخالفوں نے مجھے کافر، میری والدہ، مری بیوی اور میرے بچوں کی کردار کشی کی مگر میں نے برداشت کیا۔ اب وہ میری عوام کو گالی نکالنے لگے ہیں، نہیں میں یہ برداشت نہیں کرسکتا، میں کبھی معاف نہیں کرسکتا''۔

''بینظیر بھٹو'' سے ''پہلی ملاقات'' میں گوئندی 1977 کے اس پاکستان کی طرف کھل کر بات کرتا ہے جسکو آج لوگ بھول چکے ہیں۔ ''پورے ملک پر سکوت طاری تھا۔ آمریت نے ''امن کی فضا'' کچھ ایسی مسلط کر دی تھی کہ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ کہیں کہیں کسی شہر کی گلیوں میں چند ایک نوجوان اکٹھے ہوتے اور نعرہ بلند کرتے ''بھٹو کو رہا کرو'' ''جمہوریت بحال کرو'' تو انکو پولیس کی وردی میں ملبوس نوجوان دبوچ لیتے اور انکے ہمراہ سادہ کپڑوں میں خفیہ والے اور جنرل ضیاء کے حامی ڈنڈے بردار جمہوریت کی بحالی کا نعرہ لگانے والوں اور بھٹو کے حامیوں پر ٹوٹ پڑتے۔ جب گرفتاری کے بعد فوجی عدالت میں انہیں فٹافٹ ''دس دس کوڑے اور پانچ پانچ سال قید'' کی سزا سنا دیتی۔ یہ ایک نیا پاکستان تھا''۔ ''اس لیڈر کی بیٹی کے پہلو میں کھڑا یہ نوجوان کئی خواب دیکھ رہا تھا۔ جب آنسہ بینظیر بھٹو نے تقریر ختم کر لی تو ایک کارکن اپنے قائد کی بیٹی کے کان میں کچھ سرگوشی کر رہا تھا۔ فرطِ جذبات میں اسکی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ سرگوشی کرنے والا یہ محنت کش چند روز بعد لاہور میں احتجاج کر رہا تھا۔ سرکلر روڈ سے داتا صاحب اور شاہ عالمی تک اس احتجاجی کو اسکے دوسرے ساتھی کے ہمراہ گرفتار کرنے کیلئے پولیس ناکہ لگا چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دکانیں بند اور بازار معطل کر دیے گئے۔ عبدالرشید عاجز اور یعقوب پرویز مسیح کہ دونوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ بھاٹی دروازے کے سامنے بھٹو کی رہائی کیلئے خودسوزی کرینگے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سناٹا تھا کہ وہ دونوں نوجوان ''بھٹو کو رہا کرو'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے آئے اور میرے سامنے یکا یک شعلوں میں بدل گئے۔ جلتے جسم راکھ ہوئے۔ اس محنت کش عبدالرشید کی سرگوشی جو وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا، اب پورے ملک میں خبر بن چکا تھا۔ سناٹے میں خبر کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دو جیالوں نے خود کو نذرِ آتش کر لیا''۔

''جوش اور مایوسی کی عجیب کیفیت۔ جنکا رہبر پابند سلاسل ہو، ایک آمر کی قید میں ہو، وہی اس کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ آنسہ بینظیر بھٹو نے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دبلی پتلی، نہایت کمزور، ایک بیٹی جو اپنے باپ کی رہائی کیلئے بے تاب تھی کہ کیسے جدوجہد برپا کی جائے۔ آنسہ بینظیر گھر کے اندر سے نکلیں تو دو درجن کے قریب بھٹو کے جیالوں نے پُرجوش انداز میں نعرے بازی شروع کر دی۔ ''شرم کرو حیا کرو۔ بھٹو کو رہا کرو۔ فوجی آمریت، مردہ باد''۔ ''جیوے جیوے، بھٹو جیوے''۔ گھر کے باہر دو تین سو پولیس والے بمعہ

درجنوں خفیہ والوں کے جمع تھے جو گھر کے اندر موجود لوگوں کے نام جاننے کیلئے بے چین تھے۔ مجھے اس جدوجہد میں بھرپور طریقے سے شامل ہونے کا جنون تھا۔ اپنے ہیرو کی رہائی کی جدوجہد۔ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کے رہبر کی جدوجہد۔ اسلامی کانفرنس کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی۔ آنسہ بینظیر گھر کے اندر سے لان میں آ گئیں۔ قیوم نظامی نے ان چند جیالوں سے خطاب کیلئے ایک کرسی آنسہ بینظیر بھٹو کے سامنے رکھ دی اور وہ اس پر چڑھ کر خطاب کرنے لگیں۔ ''ہمیں جنرل ضیا کی آمریت کے خلاف بھرپور جدوجہد کرنا ہوگی، ملک سے مارشل لاء کے خلاف، جمہوریت اور آئین کی بحالی، فوجی آمریت کے خلاف جدوجہد کو تیز کرنا ہوگا۔ اس فوجی ڈکٹیٹر کو ذوالفقار علی بھٹو کو رہا کرنا ہوگا''۔ وہ تقریر کیے جا رہی تھیں۔ ٹوٹی پھوٹی اُردو اور ٹوٹے پھوٹے جملے اور شکستہ آواز۔ ایک نہتی لڑکی ایک فوجی آمر کو للکار رہی تھی جسکے گرد اسکے چند غیر مسلح نہتے ساتھی تھے''۔

''سفر کی کہانی'' میں گوئندی نے ایک برطانوی خاتون مرینا وھیلر کے متعلق بہت اہم باتیں لکھی ہیں۔ مرینا بذاتِ خود ملکہ برطانیہ کی وکیل اور انکے شوہر بورس جانسن برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے۔ گوئندی کا تعلق سرگودھا سے ہے اور مرینا دھیلر کی سکھ والدہ بھی اسی شہر سے تعلق رکھتی تھیں۔ گوئندی نے مرینا کو سرگودھا میں پرانے گردوارے دکھائے جن میں سے ایک امام بارگاہ بن چکا تھا۔ لکھتا ہے۔ ''1947 کی ہجرت کے سبب بابا گورونانک کے ماننے والوں کی جگہ، یہاں امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کا غم ایک دوسرے سے بانٹتے ہیں۔ مرینا خود کو شیعہ امام بارگاہ میں پا کر حیران ہوئے جا رہی تھی۔ یقیناً اسی فرش کو اسکی والدہ اور نانا کے قدموں نے چھوا ہوگا۔ طرزِ تعمیر کے حوالے سے یہ امام بارگاہ ابھی تک گوردوارہ ہی لگتی ہے۔ اسکے اندر دیوار کی دائیں جانب ایک ہندو بھگوان کا مندر ابھی تک موجود ہے۔ مگر پجاریوں کے بغیر، جسکی سیڑھیوں پر مندر کیلئے چندہ دینے والے ہندو ساہوکاروں کے ناموں کی تختیاں ابھی تک موجود ہیں۔ کسی کے دس روپے اور کسی کے پانچ روپے چندے کی تختی۔ صحن میں جہاں کبھی کیسری رنگ کا نانکی پرچم لہراتا تھا، اب سیاہ علَم عباس سربلند ہے۔ وقت کا دھارا زمانے کو کس قدر بدل دیتا ہے۔ اسکا احساس تب ہی ہوتا ہے، جب ہم تاریخ کی جڑوں تک جا پہنچیں۔ سرگودھا، لندن اور استنبول، مسلمان، سکھ اور مسیحی، گوردوارہ، امام بارگاہ، عمارت وہی مگر پجاری بدل گئے۔ یہ سب کچھ اس کہانی کے سال ہی کے اندر برپا ہوا''۔

''ابدی نیند سوئے ہوئے دوست سے ملاقات'' میں گوئندی درج کرتا ہے۔ اور ''میرے سفر، اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ اس سیاسی جہاں گردی میں مجھے کیسی کیسی ہستیوں سے ملاقاتوں کا شرف ہوا اور کئی دوستیوں میں بدل گئیں۔ مشرقی تیمور کے Jose Ramos Horta، حسنین ہیکل، پیلو مودی، رمزے کلارک، اردال اِنونو (عصمت اِنونو کے بیٹے)، جمال نکرومہ (مشہور افریقی رہنما کوامے نکرومہ کے بیٹے)، اُردن کے شاہ حسین، پرنس حسن بن طلال، ایک طویل فہرست ہے۔ لیکن ایسی دوستی جو محبت میں بدل گئی، یہ دوستی ترکی کے چار مرتبہ وزیراعظم بننے والے مرحوم بلند ایجوت سے ہے۔ ایک ایسی محبت جو عزت اور احترام سے لبریز ہے۔ اعتماد کا ایک ناقابل یقین تعلق۔ ایک درمیانے طبقے کے نوجوان کی دوستی ایک سابق وزیراعظم سے، جو اَسی کی دہائی میں فوجی آمریت کے دنوں میں آئین کے تحت دس سال سیاست کرنے سے محروم کر دیا گیا۔ ساٹھ، ستر، اَسی اور نوے کی دہائیوں تک اپنے ملک

کے مقبول ترین رہنما کا اعزاز رکھنے والی شخصیت جو اپنی وفات کے بعد اپنی شفافیت کے حوالے سے مشرقِ وسطیٰ اور یورپ میں ترکی کی سب سے قابل احترام سیاسی شخصیت کے طور پر جانی جاتی ہے''۔

''لوگ درلوگ'' پڑھتے پڑھتے، رات کیسے گزری، پتہ نہیں چلا۔ مگر اس وقت سے یہ بھی سوچ رہا ہوں، کہ یہ فرخ سہل گوئندی، دراصل ہے کون۔ کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ شائد گوئندی ایک مزاحمتی درویش ہے یا شائد کچھ اور؟

راؤ منظر حیات